اَلعِلم وَالایمان

شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ:۔ عبدالحمید صدیقی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس دور کا انسان ـــــ جو علم کے لحاظ سے بام عروج تک پہنچ چکا ہے ـــــ دین و مذہب کے اصول وضوابط کا حاجت مند نہیں ہے۔ وہ مجرد علم کی بنیاد پر زندگی کا صحیح رخ متعین کر سکتا ہے اور اپنے معاملات میں نظم و توازن پیدا کر کے بہتر طور پر جی سکتا ہے۔ نیز وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ علم کا پیش کردہ نظریۂ زندگی عقلی و نفسیاتی لحاظ سے درست ہوگا جبکہ ان کے نزدیک مذہب، ایمان بالغیب جیسے غیر علمی نظریات سے ذہنوں کے اندر خلجان پیدا کرتے ہیں۔ دوسری چیز جو ان پرستارانِ علم کے لیے زیادہ کشش رکھتی ہے وہ ہے حریت فرد۔ ان کے خیال میں مذہب نے حلال و حرام کے نام سے فرد کی آزادی کو قدم قدم پر پامال کیا ہے لہذا جب انسان محض علم کی رہنمائی میں زندگی بسر کرے گا تو وہ اپنی آزادی کا تحفظ کر سکے گا۔ تیسری چیز جو ان کے نظریے کے مطابق پرستش حق میں جاتی ہے وہ حیاتِ دنیا اور اس کی ترقی کے لیے بھرپور کوشش ہے۔ کیونکہ دین، دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس کی نظر میں تمام اہمیت عالم آخرت کو حاصل ہے پس جب ایک چیز کی قدر و قیمت کا ہی دین قائل نہیں تو وہ اس کے حصول کے لیے زور کیسے دے سکتا ہے۔ لیکن علم کی روشنی میں جب زندگی بسر ہوگی تو حیاتِ دنیا کی طرف انسان بھرپور توجہ دے سکے گا۔

یہ وہ تین امور ہیں جن کی بنیاد پر آج کا ذی علم انسان دین و مذہب سے گریزاں ہے اور ایمان کی افادیت کا منکر۔ ذیل میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ مذکورہ بالا دعاوی اپنے اندر کس حد تک صداقت رکھتے ہیں؟

علم اور ایمان کے مختلف دوائرِ عمل علم کی ایک حد ہے جہاں سے وہ آگے نہیں جا سکتا یعنی مادہ اور محسوسات کی محدود دنیا۔ علم مشاہدات و تجربات کر سکتا ہے اور اپنے تجربات سے صحیح یا غلط نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ حس سے ماوراء اور مادہ سے آگے کیا ہے؟ تو علم اس باب میں بالکل خاموش ہے۔ علم کی رسائی حقائقِ اشیاء کے ایک حصہ تک ہے یعنی اس کے ظاہری پہلو تک۔ باطن کے بارے میں علم کچھ نہیں جانتا۔ موجود اشیاء کیا ہیں اور کیسے ہیں ـــ

مادی چیزوں کے بارے میں علم صرف انہی سوالات کا جواب دے سکتا ہے رہا یہ سوال کہ وہ کیوں ہیں تو اس کا جواب دینا علم کے بس کی بات نہیں یہ ایمان کا کام ہے۔ مادہ کا محرک اوّل کیا ہے؟ موجودات کی غایت الغایات کیا ہے؟ محسوسات و مشاہدات سے ماوراء کیا ہے؟ اور ظاہر اشیاء کا باطن کیا ہے؟ ان سب سوالات کا نہایت شافی جواب صرف ایمان کے پاس ہے۔ آدمی مر کے کہاں جاتا ہے؟ روح انسانی کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کا اس کائنات کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے؟ عالم افلاک اور سیاروں کو کس عظیم طاقت نے ایک زبردست انتظام میں جکڑ رکھا ہے؟ کیوں جکڑ رکھا ہے؟ اس کائنات کی ابتداء کب ہوئی اور اس کی انتہا کیا ہے ان تمام امور سے بحث صرف ایمان کرتا ہے علم و عقل کے پَر اس مقام پر جلنے لگتے ہیں۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجرد علم پر انحصار کرنے والے حقائق سے پوری طرح آگاہ نہیں ہو سکتے اور ان کے لیے یہ ایمان ہی کے محتاج ہیں۔ تو جس علم کی بے چارگی و کوتاہی کا یہ عالم ہے اس کے پرستاروں کی ضلالت اور حقیقت سے بُعد کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

علم کے نتائج قطعی و یقینی نہیں ہوتے علم کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس کے اخذ کردہ نتائج بلحاظِ صحت قطعی و یقینی نہیں ہوتے۔ تاریخ میں علم کے ساتھ بارہا یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ ایک وقت میں علم نے جس چیز کو مسلمہ حقیقت قرار دیا بعد کے ادوار میں وہ از قسمِ اوہام و اباطیل سمجھی گئی۔ اسی سلسلہ میں ایک امریکی اسکالر[1] کے تاثرات ملاحظہ کیجیے۔ "علوم تجربہ شدہ حقائق کا نام ہے لیکن یہ حقائق انسان کے اوہام و خیالات سے بھی متاثر رہتے ہیں۔ نیز انسان کا ان حقائق کے ملاحظہ و وصف و استنتاج میں دقتِ نظر سے کام نہ لینا بھی ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بنا بریں نتائج علوم ایک تو اشیاء کی کیفیت و کمیت تک محدود ہوتے ہیں دوسرے احتمالات سے شروع ہو کر احتمالات پر ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی صحت یقینی ہے زیادہ سے زیادہ جو بات کی جا سکتی ہے وہ ان کا اقرب الی الصحت ہونا ہے تاہم خطا و احتمالِ خطا سے پاک وہ بہرحال نہیں ہوتے۔"

علمی پختگی ایمان کی طرف رہنمائی کرتی ہے علم سے مکمل رہنمائی حاصل کرنے کے مدعی حضرات نے علم کو ایمان کے بالمقابل لا کھڑا کیا ہے حالانکہ علم، ایمان کا حریف نہیں نہ اس کا مدمقابل ہے بلکہ ایمان کی طرف رہنمائی

---

[1] امریکی مصنف مارٹ اسٹانلی کونجدن کا مقالہ کتاب اللہ یتجلی فی عصر العلم میں۔

کرنے والی ایک چیز ہے۔ تاریخ میں بہت سے راسخین فی العلم ایسے نظر آتے ہیں جن کے علم نے اُن کی حقیقت کی طرف رہنمائی کی اور وہ اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک برتر قوت ایسی موجود ہے جو اس کی تدبیر وانتظام فرما رہی ہے اور جس نے ہر چیز کو ٹھیک ٹھیک اندازے سے اس کے اصل مقام پر رکھا ہے۔ ایک عالم کے لیے اس امر کو جاننا دوسروں کی بہ نسبت آسان ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں کتنا ربط و نظم اور کتنا استحکام پایا جاتا ہے اسے سموات والارض کی تخلیق میں، رات اور دن کے اختلاف میں، سمندر کے سینہ پہ رواں دواں کشتیوں اور جہازوں میں اور آسمان سے نازل ہونے والے پانی میں اللہ کی بے حد و بے حساب نشانیاں نظر آتی ہیں۔ ہواؤں کی گردش میں، آسمانوں و زمین کے مابین مسخر بادلوں میں اور روئے زمین پر انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کے وجود میں جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں اس کا علم اسے ان کی مکمل معرفت بخشتا ہے اور نتیجۃً اس کا سر خدائے حی و قیوم کی چوکھٹ پر جھک جاتا ہے۔ استاذ ہوشل رقم طراز ہے "علم میں جیسے جیسے وسعت آتی ہے ایک ازلی و ابدی خالق کے وجود پہ دلالت کرنے والی براہین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ خالق کہ جس کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں پس آج ماہرین حیاتیات، ریاضی دان، ہیئت دان اور ماہرینِ طبیعات نے علم کے جس عظیم الشان قصر کی تزئین کی ہے وہ درحقیقت اللہ وحدہ لا شریک کی عظمت کا قصر ہے"۔

اسی معنیٰ میں ہربرٹ سپنسر لکھتا ہے "علم اوہام و خرافات کی تردید تو کرتا ہے لیکن دین کی تردید کبھی نہیں کرتا۔ آج اکثر و بیشتر علمِ طبیعی میں الحاد و زندقہ کی روح سرایت کئے ہوئے ہے حالانکہ علمِ صحیح جو حقائق کی گہرائیوں میں جاگزین ہے اس روح سے قطعی طور پہ بیزار ہے۔ علمِ طبیعی دین کے منافی نہیں بلکہ اس علم میں رسوخ پیدا کرنا اور اس کی طرف توجہ دینا تو ایک لحاظ سے عبادت کرنا ہے۔ ایک طرح کی تسبیح خوانی ہے ایسی تسبیح جو زبان کی حرکت سے نہیں بلکہ تجربہ و عمل سے تعلق رکھتی ہے"۔ ڈاکٹر ڈمی نوی جو نہایت ذی علم طبیب ہیں علم طبیعی پہ کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں "بہت سے سمجھدار اور بزعم خود نیک نیت لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لا سکتے۔ کیونکہ وہ اللہ کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں حالانکہ ایک علمی شوق رکھنے والا آدمی اللہ کا تصور زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ وہ بجلی کے بارے میں کئے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے بارے میں اس کے تصور کی نوعیت بالکل ناقص ہے۔ بجلی اپنا کوئی مادی وجود نہیں رکھتی بایں ہمہ وہ ایک لکڑی کے ٹکڑے سے (جو بہرحال مادی وجود رکھتا ہے) زیادہ بہتر طور پر اپنا وجود

حضرتِ انسان سے منوا لیتی ہے" پس اللہ تعالیٰ کے مادی وحسی وجود پر اصرار کرنا اور ماننے کے لیے اسے شرطِ لازم قرار دینا ایک غیر علمی بلکہ احمقانہ حرکت ہے۔

اہلِ علم کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم، ایمان کا بدل کبھی نہیں بن سکتا بلکہ علمِ صحیح، ایمان کی صداقت کا شاہد عادل ہے ایمان کی منزل تک پہنچانے والی ایک روشنی ہے بجائے خود منزل نہیں۔

عقل ونفسیات کا معاملہ ایمان سے ہٹ کر جو نظریۂ زندگی خالص علمی بنیاد پر اختیار کیا جائے گا کہا جاتا ہے کہ وہ عقلی ونفسیاتی اعتبار سے درست ہوگا۔ لیکن واقعات اس امر کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور مغرب کے مادی تمدن نے بھی اس کی نفی کر دی ہے۔ مغرب کے اہلِ علم کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے تجربی علم اور فنی ترقی کی بنیاد پر ایسا نظریۂ حیات اور ایسے اصولِ زندگی دریافت کر لیں گے جو عقلی ونفسیاتی لحاظ سے صحیح ہوں گے۔ برطانوی مورخ اور فلسفی ٹائن بی کی شہادت سنیئے۔" میں نے صنعتی فنون کی گہرائی میں ڈوب کر دیکھا تو محسوس کیا کہ ان انسانوں نے اپنی زندگی کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے اور انھوں نے پرانے دیوں کی جگہ یہ کچھ نئے چراغ خرید لیے ہیں۔ یہ گمراہی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ انسانوں نے اپنی جانوں کا سودا کر لیا اور بدلے میں سینما اور ریڈیو لے لیے۔ اس تہذیبی تباہی ـــــ جس کا سبب تازہ ترین لین دین تھا ـــــ کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلب وروح کی دنیا برباد ہو کر رہ گئی۔ ایسے ہی معاشرہ کو افلاطون نے خنزیروں کا معاشرہ قرار دیا تھا اور الڈس ہکسلے نے اسی کو" ایک نئے ظاہر فریب مگر تاریک باطن جہان" سے تعبیر کیا"۔ اس بحث کے اختتام پر ٹائن بی لکھتا ہے: "اب مغرب کی نجات اس میں ہے کہ اپنے نظامِ معیشت سے رخ پھیرے اور دین کی طرف رجوع کرے"۔ لیکن ٹائن بی یہیں یہ نہیں بتاتا کہ اس انتقال کی صورت کیا ہو؟ وہ صرف یہ تاکید کرتا ہے "مغرب کا انسان صرف دین کی وساطت سے وہ روحانی بالا دستی حاصل کر سکتا ہے جو مادی قوت سمیت اس کی سلامتی کی ضامن ہے جسے اس وقت مغربی صنعت کے مشینی دور نے نظر انداز کر رکھا ہے"۔ ڈاکٹر الیکس کریل جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تجربہ گاہوں میں تجربات کرتے گزارا ہے اور جو جدید علم کا وافر ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں رقم طراز ہیں "تعجب ہے کہ دماغی امراض دوسرے تمام امراض سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور شفاخانہ ہائے امراضِ دماغی پاگلوں سے بھرے پڑے ہیں اور نئے مریضوں کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں"۔ س۔ د۔ بیرس کا تجربہ یہ ہے کہ

۱؎ کو کالن ولسن نے اپنی کتاب سقوط الحضارۃ میں اسے نقل کیا۔

نیویارک کے ہر بائیس باشندوں میں سے ایک دماغی امراض کے ہسپتال میں داخلہ کا مستحق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کریل مزید لکھتے ہیں۔" ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شفاخانوں میں پاگلوں کا علاج بڑی توجہ سے کیا جاتا ہے جن کی تعداد دق اور سل کے مریضوں سے آٹھ گنا زائد ہوتی ہے۔ وہاں ہر سال چھیاسی ہزار کے لگ بھگ افراد دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے لوگ پاگل ہوتے رہے تو لاکھوں کروڑوں بچے اور جوان جو اس وقت سکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں جلد یا بدیر انھیں نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے ہسپتالوں میں داخلہ لینا پڑے گا۔ ڈاکٹر موصوف ایسے ہی مزید کئی اعداد و شمار دینے کے بعد لکھتے ہیں۔" یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ دورِ جدید کا متمدن انسان کس تباہی سے دوچار ہے۔ اور جدید معاشرہ میں دماغی صحت کا مسئلہ کتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دماغی امراض ہی نہایت خطرناک۔ یہ دق سل سرطان اور گردہ و دل کے امراض سے زیادہ خطرناک ہیں۔ بلکہ تپ محرقہ، طاعون اور ہیضہ بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ پس اسی پہلو سے ہی یہ امراض لائقِ اعتنا نہیں کہ ان سے مجرموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی ان کے فوری سدباب کی کوشش کرنی چاہیئے کہ ان کی بنا پر وہ تفوق اور برتری متاثر ہو رہی ہے جو سفید فام نسلوں کو دوسری انواعِ بشر پر حاصل ہے۔

اسی سلسلہ سے تعلق رکھنے والی ایک خبر ملاحظہ فرمایئے، امریکہ کی پولیس نے باغی ادباء کی ایک انجمن کے دسیوں ارکان کو گرفتار کر لیا۔ اس کا سبب شعر و ادب پر مبنی ان کی قابلِ اعتراض تخلیقات و نگارشات نہ تھیں بلکہ ان کا عیناک رہن سہن، ان کا بکثرت افیون کھانا اور ان نشہ آور اشیاء کے استعمال کا خطرناک طور پر دفاع کرنا تھا۔ ان کی گرفتاری پر انجمن ہی کے ایک ممبر ولیم رارک نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔" زندگی تلخ و ترش ہو گئی ہے اور لوگ مسلسل تعب و مشقت کا شکار ہیں اب اس نشہ کے روگ سے مفر کی کوئی صورت نہیں سوا اس کے کہ لوگ اپنے آپ کو دنیا کے خواب و خیال میں پہنچا دیں اور بے کاری و سستی کے مزے لوٹیں۔

یہ ہے وہ نفسیاتی و عقلی اعتبار سے صحیح دورِ زندگی جسے مغرب کے اہلِ علم نے دین و ایمان سے ہٹ کر دریافت کیا ہے اور جس پر جدید تہذیب و تمدن کو ناز ہے اور جس کے تلخ و تاریک نتائج کو دیکھ کر مغرب ہی کے سلیم الفکر دانشور چیخ اٹھے ہیں اور اپنے اربابِ حل و عقد کو دین و ایمان کی طرف لوٹنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

شخصی آزادی اور اس کے نتائج ملحدانہ فکر کے علمبرداروں نے دین و ایمان کے خلاف اس لیے بھی بہت پراپیگنڈا کیا ہے کہ مذہب انسان پر بے جا پابندیاں عاید کرتا ہے اور قدم قدم پر اس کی آزادی کو سلب کر لیتا

ہے۔ اس کے مقابلے میں انہوں نے بنام علم جو نظریۂ زندگی پیش کیا ہے ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں آزادیٔ فرد میں کہیں مداخلت نہیں کی گئی۔

جہاں تک اُن حدود و قیود کا تعلق ہے جو عقیدۂ اسلام میں انسان پر عائد کی گئی ہیں وہ فرد کی آزادی میں مداخلت نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے حقوق میں توازن کا قیام ہے۔ ایک شخص اگر بلا روک ٹوک خواہشِ نفس پوری کرنا چاہے تو بلاشبہہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں۔ ایک اور صاحب اگر کسی کی جیب پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو ایسی آزادی کی بھی دین و ایمان میں کوئی گنجائش نہیں۔ فضائلِ اخلاق کو چھوڑ کر اگر کوئی آدمی رذائل اختیار کرتا ہے تو یقیناً اس کی بھی گرفت کی جائے گی۔ زبان کا غلط استعمال، طاقت کا ناروا مظاہرہ اور دولت کا ضیاع و بے جا صرف یہ سب ایسے کام ہیں جن کے ارتکاب کی اگر کھلم کھلا اجازت دے دی جائے تو معاشرتی زندگی کا امن و سکون غارت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پس جہاں تک اُس آزادی کا تعلق ہے جس سے انسانوں کے باہمی حقوق سلب ہو جانے کا خطرہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی آزادی دین و ایمان کی رو سے حرام اور ممنوع ہے۔ رہی وہ آزادی جو انسان کی شخصیت کی نشوونما کے لیے ضروری ہے اور جس سے دوسرے افراد کے حقوق اور مفاد ملک و قوم متاثر نہیں ہوتا اس آزادی کو نہ صرف یہ کہ مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے تحفظ کی بھی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے۔

اب آیئے ذرا اس معاشرے کی حالت کا جائزہ لیں جو خود کو علم و شعور سے بہرہ ور سمجھتا ہے اور جہاں نام نہاد شخصی آزادی پائی جاتی ہے اور دیکھیں کہ اس نے زندگی کی اعلیٰ اقدار کا کس بے دردی سے خون کر ڈالا ہے۔

(ا) ایک برطانوی سوسائٹی جو جنسی بے راہ روی کا علاج سوچنے کے لیے معرضِ وجود میں آئی تھی اس کی رپورٹ یہ ہے کہ برطانیہ میں دس لاکھ افراد اور بسا اوقات اس سے بھی زیادہ لوگ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہیں۔ (الاہرام، قاہرہ، مئی ۱۹۶۵ء)۔

(ب) سات کروڑ بیس لاکھ امریکی شراب پیتے ہیں جن میں سے دو کروڑ امریکی اپنے فرائض سے کوتاہی کے مرتکب ہو کر ہر سال حکومت کو کھربوں ڈالر کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ (الاہرام قاہرہ ۳ مئی ۱۹۶۵ء)۔

(ج) سویڈش عورتوں نے جنسی آزادی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرہ میں ملک کے ہر حصہ سے تعلق رکھنے والی خواتین نے شرکت کی جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی (اخبار الیوم

قاہرہ ۲۴ اپریل ۱۹۶۴ء۔

(۵) جرائم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیشانی پر کلنک کا داغ ہیں۔ پولیس کے رجسٹر ایسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں کہ تجارتی مقامات سے خرید و فروخت کے دوران لوگوں کی خرید کردہ اشیاء یا دوکانداروں کی چیزیں اچک لی گئیں۔ اور خواتین کے بیگ تک ان سے چھین لیے گئے۔ دوسری طرف ایوان ہائے عدالت سلب و نہب اور قتل و خونریزی کے مجرموں سے معمور ہوتے ہیں۔

امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک جو علوم و معارف اور تہذیب و تمدن کا گہوارا سمجھے جاتے ہیں کا حال یہ ہے کہ رہائشی علاقوں میں نصف سے زائد لوگ غروب آفتاب کے بعد گھروں سے باہر نکلتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔ اور ایک تہائی کے قریب ایسے حضرات ہوتے ہیں کہ قبیلے میں کسی اجنبی کو دیکھتے ہی جن کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ اور آبادی کا ایک خمس وہ اصحاب ہیں جو خوف و اضطراب کے مارے نکل بھاگنا چاہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کدھر جائیں اور کہاں امن و سکون میسر آسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ہر سال ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے جو نقل مکانی کر جاتے ہیں یا اپنے گھروں اور موٹروں میں بندوقیں اور دوسرا آتشین اسلحہ رکھنے کے اجازت نامے حاصل کرتے ہیں۔ نیز حفاظت و نگہبانی کرنے والے موٹے تازے درندہ صفت کتوں کا وجود تو گھروں کی فطری ضرورت بن چکا ہے۔

یہ سب نتائج کس بات کے ہیں؟ نام نہاد شخصی آزادی کے۔ انار کی و بے راہروی کے اور عقیدہ و ایمان سے بے زاری کے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ بدعنوانیوں، در جرائم سے بھرپور ایسے معاشرے کو کیا کوئی نسبت ہو سکتی ہے اُس پُرسکون اور خوشگوار معاشرے سے جسے عقیدہ و ایمان جنم دیتا ہے۔ جہاں کسی کی زبان اور ہاتھ دوسرے کے مال جان اور عزت پر حملہ آور نہیں ہوتا۔ جہاں چوری اور ڈاکے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لوگ کامل یکسوئی اور اطمینان سے اپنے مال و اسباب سے بھری ہوئی دوکانیں کھلی چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں گھروں کے دروازوں کو تالا لگانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں ہر آدمی دوسرے کو بھائی سمجھتا ہے اور اس کی ہمدردی اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔

ایمان اور حیاتِ دنیا آخری سوال جو ایمان سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے والے لوگ کرتے ہیں یہ ہے کہ عقیدہ ایمان، حیاتِ دنیا کے لیے سعی و جد و جہد کا قائل نہیں اس کی نظر میں دنیا کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور وہ تمام توجہ اخروی زندگی پر ہی مرکوز رکھتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہاں از سرِ نو شرح و بسط سے

دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک گذشتہ باب میں "ایمان اور اس کے مادی و اقتصادی نتائج" کے زیرِ عنوان ہم اس پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایمان پہ مبنی تعلیمات دنیا کی زندگی کے لیے بھی اسی طرح رہنما اصول ہیں جس طرح کہ آخرت کے لیے۔ دنیوی زندگی کے مسائل و مشکلات کا ان میں حل بتایا گیا ہے اور ان سے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے پھر آخر اس سوال میں کیا معقولیت ہے کہ ایمان حیاتِ دنیا سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ زیرِ نظر کتاب "الایمان والحیوٰۃ" کے سینکڑوں صفحات میں جن امور کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان کا تعلق دنیا کی زندگی سے ہی تو ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ حیاتِ دنیا اور اس کے سروسامان سے وہ مجنونانہ وابستگی کا قائل نہیں کیونکہ یہ چیزیں بہرحال ناپائدار اور فانی ہیں تاہم ایک دانا و بینا شخص کو زوال پذیر اور فنا انجام اشیاء سے ان کی افادیت کے پیشِ نظر جتنا تعلق رکھنا چاہیئے اور ان کے حصول کے لیے مناسب حد تک جتنی سرگرمی دکھانی چاہیئے ایمان اس کا ضرور قائل ہے اس سے زیادہ کا نہیں۔